لفظ

ظلوم اور جہول کی مزید تشریح

اور نزولِ روح القدس اور لمۃ ملک اور لمۃ ابلیس

کی حقیقت اور اس پر اعتراضات کے جوابات

حصہ دوم

ماخوذ از کتاب: آئینہ کمالاتِ اسلام مصنفہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام

شائع کردہ

جناب شیخ عبد الرحمان مصری صاحب

ناشر

شعبہ دعوت و ارشاد

احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام۔ لاہور

بار اوّل - جولائی ۱۹۷۸ء - قادر پریس لاہور - تعداد: ایک ہزار

www.aaiil.org

قرآن کریم کی ایک آیت پر بحث کرتے ہوئے جس کی تفسیر ایک دوسرے ٹریکٹ میں گذر چکی ہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام فرماتے ہیں۔ اس سے غرض یہ ہے کہ ظالم دو قسم کے ہیں۔

۱:- ایک متقی ظالم جن کی نجات کا وعدہ ہے اور جو خدا تعالیٰ کے پیارے ہیں اور جو آیت فمنھم ظالم میں ناجیوں میں شمار کئے گئے ہیں۔

۲:- دوسرے مشرک اور کافر اور سرکش ظالم جو جہنم میں گرائے جائیں گے

۳: اور اس آیت میں بیان فرمایا کہ متقی بھی اس نار کی جس سے خالی نہیں ہیں۔ اس بیان سے مراد یہ ہے کہ متقی اسی دنیا میں جو دار الابتلاء ہے انواع اقسام کے پیرایہ میں بڑی بردباری سے اس نار میں اپنے تئیں ڈالتے ہیں۔ اور خدا تعالیٰ کے لئے اپنی جانوں کو ایک بھڑکتی ہوئی آگ میں گراتے ہیں اور طرح طرح کے آسمانی قضا و قدر بھی نار کی شکل میں ان پر وارد ہوتے ہیں۔ وہ ستائے جاتے اور دکھ دیئے جاتے ہیں۔ اور اس قدر بڑے بڑے زلزلے ان پر آتے ہیں۔ کہ ان کے ماسوا کوئی ان زلازل کی برداشت نہیں کر سکتا۔ اور حدیث صحیح میں ہے کہ تپ بھی جو مومن کو آتا ہے وہ نار جہنم میں سے ہے۔ اور مومن بوجہ تپ اور دوسری تکالیف کے نار کا حصہ اسی عالم میں لے لیتا ہے۔ اور ایک دوسری حدیث میں ہے کہ مومن کے لئے اس دنیا میں بہشت دوزخ کی صورت میں

متمثل ہوتا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کی راہ میں تکالیف شاقہ جہنم کی صورت میں
اسکو نظر آتی ہیں۔ پس وہ بطیب خاطر اس جہنم میں وارد ہو جاتا ہے۔ تو معاً
اپنے تئیں بہشت میں پاتا ہے۔ اسی طرح اور بھی احادیث ہیں جو بکثرت
موجود ہیں۔ جن کا ماحصل یہ ہے کہ مومن اسی دنیا میں نار جہنم کا حصہ لے
لیتا ہے۔ اور کافر جہنم میں بجبر و اکراہ گرایا جاتا ہے۔ لیکن مومن خدا تعالیٰ
کے لئے آپ آگ میں گرتا ہے۔ ایک اور حدیث اسی مضمون کی ہے۔ جس
میں لکھا ہے۔ کہ ایک حصہ نار کا ہر ایک بشر کے لئے مقدر ہے۔ چاہے
تو وہ اس دنیا میں اس آگ کو اپنے لئے خدا تعالیٰ کے راہ میں قبول
کر لیوے اور چاہے تو تنعم اور غفلت میں عمر گزار دے اور آخرت میں اپنے
تنعم کا حساب دیوے اور آیت وان منکم الا واردھا کے ایک دوسرے
معنے بھی ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ عالم آخرت میں ہر ایک سعید اور شقی کو متمثل
کر کے دکھلا دیا جائے گا۔ کہ وہ دنیا میں سلامتی کی راہوں میں چلا یا اس نے
ہلاکت اور موت اور جہنم کی راہیں اختیار کیں۔ سو اس دن وہ سلامتی کی راہ
جو صراط مستقیم اور نہایت باریک راہ ہے۔ جس پر چلنے والے بہت تھوڑے
ہیں۔ اور جس سے تجاوز کرنا اور ادھر ادھر ہونا درحقیقت جہنم میں گرنا
ہے۔ متمثل کے طور پر نظر آ جائے گی۔ اور جو لوگ دنیا میں صراط مستقیم پر چل نہیں
سکے وہ اس روز اس صراط پر بھی چل نہیں سکیں گے۔ کیونکہ وہ صراط درحقیقت
دنیا کی روحانی صراط کا ہی ایک نمونہ ہے اور جیسا کہ ابھی روحانی آنکھوں سے
ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ہماری صراط کے دائیں بائیں درحقیقت جہنم ہے۔ اگر ہم

صراط کو چھوڑ کر دائیں طرف ہوئے تب بھی جہنم میں گرے اور اگر بائیں طرف ہوئے تب بھی گرے اور اگر سیدھے صراطِ مستقیم پر چلے تب جہنم سے بچ گئے یہی صورت جسمانی طور پر عالمِ آخرت میں ہمیں نظر آجائے گی۔ اور ہم آنکھوں سے دیکھیں گے کہ درحقیقت ایک صراط ہے۔ جو پل کی شکل پر دوزخ پر بچھایا گیا ہے۔ جس کے دائیں بائیں دوزخ ہے۔ تب ہم مامور کئے جائیں گے کہ اس پر چلیں۔ سو اگر ہم دنیا میں صراطِ مستقیم پر چلتے رہے ہیں اور دائیں بائیں نہیں چلتے تو ہم کو اس صراط سے کچھ بھی خوف نہیں ہوگا۔ اور نہ جہنم کی بھاپ ہم تک پہنچے گی۔ اور نہ کوئی فزع اور خوف ہمارے دل پر طاری ہوگا۔ بلکہ نورِ ایمان کی قوت سے چمکتی ہوئی برق کیطرح ہم اس سے گذر جائیں گے۔ کیونکہ ہم پہلے اس سے گذر چکے ہیں۔ اسی کی طرف اللہ جل شانہٗ اشارہ فرماتا ہے۔ من جآء بالحسنۃ فلہٗ خیرٌ منہا وھم من فزعٍ یومئذٍ اٰمنون۔" الجزو نمبر ۲۰ سورۃ القصص۔ یعنے نیکی کرنے والا کو قیامت کے دن اس نیکی سے زیادہ بدلا ملے گا۔ اور وہ ہر ایک ڈر سے اس دن امن میں رہیں گے۔ ایسا ہی فرمایا ہے، یا عباد لا خوف علیکم الیوم ولا انتم تحزنون" الجزو ۲۵ سورۃ الزخرف" یعنے اے میرے بندو آج کے دن کچھ تم کو خوف نہیں اور نہ کوئی غم تمہیں ہو سکتا ہے۔ لیکن جو شخص دنیا میں صراطِ مستقیم پر نہیں چلا وہ اس وقت بھی چل نہیں سکے گا۔ اور دوزخ میں گرے گا۔ اور جہنم کی آگ کا ہیمہ بن جائے گا۔ جیساکہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے:-

ومن جاء بالسیئۃ فکبت وجوھھم فی النار ھل تجزون الا ما کنتم تعملون" الجزو ع ۲ "یعنے بدی کرنے والے اسدن جہنم میں گرائے جائیں گے اور کہا جائے گا کہ یہ جزا درحقیقت وہی تمہارے اعمال ہیں۔ جو دنیا میں تم کرتے تھے۔ یعنی خداتعالےٰ کسی پر ظلم نہیں کرے گا۔ بلکہ نیکی کے اعمال جنت کی صورت میں اور بدی کے اعمال دوزخ کی صورت میں ظاہر ہوجائیں گے۔

جاننا چاہیئے کہ عالم آخرت درحقیقت دنیوی عالم کا ایک عکس ہے۔ اور جو کچھ دنیا میں روحانی طور پر ایمان اور ایمان کے نتائج اور کفر اور کفر کے نتائج ظاہر ہوتے ہیں وہ عالم آخرت میں جسمانی طور پر ظاہر ہوجائیں گے اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے: من کان فی ھٰذہ اعمٰی فھو فی الاخرۃ اعمٰی یعنی جو اس جہان میں اندھا ہے وہ اس جہان میں بھی اندھا ہے گا ہمیں اس تمثلی وجود سے کچھ تعجب نہیں کرنا چاہیئے اور ذرا سوچنا چاہیئے کہ کیونکر روحانی امور عالم رویا میں متمثل ہوکر نظر آجاتے ہیں۔ اور عالم کشف تو اس سے بھی عجیب تر ہے۔ کہ باوجود عدم غیبت حس اور بیداری کے روحانی امور طرح طرح کے جسمانی اشکال میں انہیں آنکھوں سے دکھائی دیتے ہیں۔ جیسا کہ بااوقات عین بیداری میں ان روحوں سے ملاقات ہوتی ہے جو اس دنیا سے گذر چکے ہیں۔ اور وہ اسی دنیوی زندگی کے طور پر اپنے اصلی جسم میں اسی دنیا کے کپڑوں میں سے ایک پوشاک پہنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اور باتیں کرتے ہیں اور بااوقات ان میں سے مقدس لوگ باذنہٖ تعالےٰ آئندہ کی خبریں دیتے ہیں۔

اور وہ خبریں مطابق واقعہ نکلتی ہیں۔ بسا اوقات عین بیداری میں ایک شربت
یا کسی قسم کا میوہ عالم کشف سے ہاتھ میں آتا ہے۔ اور وہ کھانے میں نہایت
لذیذ ہوتا ہے۔ اور ان سب امور میں یہ عاجز خود صاحب تجربہ ہے کشف
کی اعلیٰ اقسموں میں سے یہ ایک قسم ہے کہ بالکل بیداری میں واقع ہوتی ہے۔
اور یہاں تک اپنے ذاتی تجربہ سے دیکھا گیا ہے۔ کہ ایک شیریں طعام یا کسی
قسم کا میوہ یا شربت غیب سے نظر کے سامنے آ گیا ہے۔ اور وہ ایک غیبی
ہاتھ سے موہنہ میں پڑتا جاتا ہے۔ اور زبان کی قوت ذائقہ اس کے لذیذ
طعم سے لذت اٹھاتی جاتی ہے۔ اور دوسرے لوگوں سے باتوں کا سلسلہ بھی
جاری ہے۔ اور حواس ظاہری بخوبی اپنا اپنا کام دے رہے ہیں۔ اور یہ
شربت یا میوہ بھی کھایا جا رہا ہے۔ اور اس کی لذت اور حلاوت بھی ایسی ہی کھلی کھلی
طور پر معلوم ہوتی ہے۔ بلکہ وہ لذت اس لذت سے نہایت الطف ہوتی ہے
اور یہ ہرگز نہیں کہ وہ وہم ہوتا ہے۔ یا صرف بے بنیاد تخیلات ہوتے ہیں
بلکہ واقعی طور پر وہ خدا جس کی شان بکل خلق علیم ہے۔ ایک قسم کے خلق کا تماشا
دکھا دیتا ہے۔ پس جبکہ اس قسم کے خلق اور پیدائش کا دنیا میں ہی نمونہ دکھائی دیتا
ہے۔ اور ہر یک زمانہ کے عارف اس کے بارے میں گواہی دیتے چلے آئے ہیں
تو پھر وہ تمثلی خلق اور پیدائش جو آخرت میں ہوگی اور میزان اعمال نظر آئے گا اور
پل صراط نظر آئے گا۔ اور بعد ایسا ہی بہت سے اور امور روحانی جسمانی تشکل کے ساتھ
نظر آئیں گے۔ اس سے کیوں عقلمند تعجب کرے۔ کیا جس نے یہ سلسلہ تمثلی خلق اور
پیدائش کا دنیا میں ہی عارفوں کو دکھا دیا ہے اس کی قدرت سے یہ بعید ہے کہ وہ

آخرت میں بھی دکھا دے۔ بلکہ ان تمثلات کو عالم آخرت سے نہایت مناسبت ہے
کیونکہ جس حالت میں اس عالم میں جو کمال انقطاع کا محل نہیں ہے یہ تمثل
پیدائش ترکیب یافتہ لوگوں پر ظاہر ہو جاتی ہے۔ تو پھر عالم آخرت میں جو اکمل اور
اتم انقطاع کا مقام ہے کیوں نظر نہ آوے۔

یہ بات بخوبی یاد رکھنی چاہیئے کہ انسان عالمِ عرفت پر اسی دنیا میں وہ مقامات عالیات
کشفی رنگوں میں کھل جاتے ہیں کہ جو ایک مجوب آدمی محض کے طور پر قرآن کریم کی
ان آیات میں پڑھتا ہے۔ جو معاد کے بارے میں خبر دیتی ہیں۔ سو جس کی نظر
حقیقت تک نہیں پہنچتی وہ ان بیانات سے تعجب میں پڑ جاتا ہے۔ بلکہ بسا اوقات
اس کے دل میں اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ کا عدالت کے دن تخت
پر بیٹھنا اور ملائک کا صف باندھے کھڑے ہونا اور ترازوں میں عملوں کا تلنا اور
لوگوں کا پل صراط پر سے چلنا اور سزا جزا کے بعد موت کو بکرے کی طرح ذبح
کر دینا اور ایسا ہی اعمال کا خوش شکل یا بدشکل انسانوں کی طرح لوگوں پر ظاہر
ہونا اور بہشت میں دودھ اور شہد کی نہریں چلنا وغیرہ وغیرہ یہ سب باتیں
صداقت اور معقولیت سے دور معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن یہ تمام شکوک اسی
ایک ہی نکتہ کے حل ہونے سے رفع ہو جاتے ہیں۔ کہ عالم آخرت ایک تمثلی
خلق کا عالم ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کے بھیدوں میں سے ایک بھید ہے کہ وہ بعض
اشیاء کو تمثلی طور پر ایسا ہی پیدا کر دیتا ہے۔ جیسا دوسرے طور پر ہوا کرتا ہے
جیسے تم دیکھتے ہو کہ آئینہ میں تمہاری ساری شکل منعکس ہو جاتی ہے۔ اور تم
خیال کر سکتے ہو کہ کس طرح عکسی طور پر تمہاری تصویر کھینچی جاتی ہے۔ کیسے بکھر

تمام خال وخط ان میں آجاتے ہیں۔ پھر اگر خداتعالیٰ نے روحانی امور کی سچی تصویر کھینچ کر اور ان میں صداقت کی جان ڈال کر تمہاری آنکھوں کے سامنے دکھلا دے تو کیوں اس سے تعجب کیا جاوے اللہ جل شانہٗ ڈھونڈنے والوں پر اسی دنیا میں یہ تمام صداقتیں ظاہر کر دیتا ہے اور آخرت میں کوئی بھی ایسا امر نہیں جس کی کیفیت اس عالم میں کھل نہ سکے۔

اور اگر یہ اعتراض کسی کے دل میں خلجان کرے کہ آیت وان منکم الا واردھا کے بعد میں یہ آیت ہے کہ ثم ننجی الذین اتقوا و نذر الظالمین فیھا جثیا" یعنے پھر ہم ضرور دوزخ کے بدمنشیوں کو نجات دیں گے اور ظالموں کو دوزخ میں گرے ہوئے چھوڑ دیں گے۔ اور نجات دینے کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ اول انسان کسی عذاب یا بلا میں مبتلا ہو کر پھر اس سے اسکو رہائی بخشی جاوے لیکن ان معنوں کی رو سے نعوذ باللہ لازم آتا ہے کہ خداتعالیٰ کے مقرب بندے کسی حد تک عذاب دوزخ میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اور پھر اس سے ان کو نجات دی جاوے گی۔ تو اس وہم کا یہ جواب ہے کہ نجات کا لفظ اس جگہ اپنے حقیقی معنوں پر مستعمل نہیں بلکہ اس سے صرف اس قدر مراد ہے کہ مومنوں کا نجات یافتہ ہونا اس وقت ظاہر کر دیں گے۔ اور لوگوں کو دکھائیں گے کہ وہ اس نشست قلق اور کرب کی جگہ سے نجات پاکر اپنی مرادات کو پہنچ گئے۔ اور قرآن کریم میں یہ سنت اللہ ہے کہ بعض الفاظ اپنی اصلی حقیقت سے پھر کر مستعمل ہوتے ہیں جیسا کہ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے: واقرضوا اللہ قرضا حسنا یعنی قرض دو اللہ قرض کر اچھا اب ظاہر ہے کہ قرض کی اصل تعریف کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ انسان حاجت

اور لاچاری کے وقت دوسرے سے بوقت دیگر ادا کرنے کے عہد پر کچھ مانگتا
ہے۔ لیکن اللہ جل شانہٗ حاجت سے پاک ہے۔ پس اس جگہ قرض کے مفہوم میں
صرف ایک چیز مراد لی گئی۔ یعنے اس طرح سے لینا کہ پھر دوسرے وقت اسکو واپس
دے دینا اپنے ذمہ واجب ٹھہرا لیا ہو۔ ایسا ہی یہ آیت ونبلونکم
بشیٔ من الخوف والجوع اصل مفہوم سے پھیری گئی۔ کیونکہ عرف عام میں
آزمائش کرنے والا اس نتیجہ سے غافل اور بے خبر ہوتا ہے۔ جو امتحان کے بعد
پیدا ہوتا ہے۔ مگر اس سے اس جگہ یہ مطلب نہیں بلکہ خداتعالے کے امتحان میں
ڈالنے سے یہ مطلب ہے کہ تا شخص زیر امتحان پر اس کے اندرونی عیب یا
اندرونی خوبیاں کھولے۔ غرض اصطلاح پر یہ لفظ نجات بھی اپنے حقیقی معنوں سے
پھیرا گیا ہے۔ جیسا کہ ایک دوسری آیت میں اس کی تصریح ثابت ہے اور وہ یہ
ہے: ویوم القیامۃ تری الذین کذبوا علی اللہ وجوھھم مسودۃ
الیس فی جھنم مثوی للمتکبرین وینجی الذین اتقوا بمفازتھم
لا یمسھم السوء ولا ھم یحزنون" الجزو نمبر ۲۴ سورۃ الزمر۔ یعنی قیامت کے
دن تو دیکھے گا کہ جنہوں نے خداتعالے پر جھوٹ بولا ان کے مونہہ کالے ہیں۔ (اور کیوں
کالے نہ ہوں) کیا یہ لائق نہیں کہ متکبر لوگ جہنم میں ہی گرائے جائیں گے۔ اور
اللہ تعالے متقیوں کو نجات دیگا۔ اس طرح سے کہ ان کو ان کی مرادات تک پہنچائیگا
ان کو برائی نہیں لگے گی۔ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اب یہ آیت اس پہلی آیت کی
گویا تفسیر کرتی ہے۔ کیونکہ اس میں نجات دینے کی حقیقت یہ کھولی ہے کہ وہ اپنی مرادات
کو پہنچ جائیں گے۔ اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ وہ اس دن برائی کی مس سے بالکل

محفوظ ہوں گے۔ ایک ذرا تکلیف ان کو چھوئے گی بھی نہیں۔ اور غم اُن کے نزدیک نہیں آئے گا۔

اور اس آیت وان منکم الا واردھا کے یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ دراصل مخاطب وہی لوگ ہوں کہ جو عذاب دوزخ میں گرفتار ہوں۔ پھر بعض ان میں سے کہ کچھ حقیقۃً تقوےٰ کا رکھتے ہیں۔ اُس عذاب سے نجات پاویں اور دوسرے دوزخ میں ہی گرے رہیں۔ اور یہ معنے اس حالت میں ہوں گے کہ جب اس خطاب سے ابرار اور اخیار اور تمام مقدس اور مقرب لوگ باہر رکھے جائیں لیکن حق بات یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ کی کلام کا منشاء وہی معنی معلوم ہوتے ہیں۔ جو ابھی ہم لکھ چکے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب والیہ المرجع والمآب۔"

اب پھر ہم بحث ظلومیت کیطرف رجوع کر کے لکھتے ہیں کہ ظلومیت کی صفت جو مومن میں ہے۔ یہی اس کو خدا تعالےٰ کا پیارا بنا دیتی ہے۔ اور اسی کی برکت سے مومن بڑے بڑے مراحل سلوک کے طے کرتا اور ناقابل برداشت تلخیاں اور طرح طرح کی دوزخوں کی جلن اور حرقت اپنے لئے بخوشی خاطر قبول کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالےٰ نے جس جگہ انسان کی اعلےٰ درجہ کی مدح بیان کی ہے اور اس کو فرشتوں پر بھی ترجیح دی ہے ساتھ مقام میں اس کی یہی فضیلت پیش کی ہے کہ وہ ظلوم اور جہول ہے۔ جیسا کہ وہ فرماتا ہے وحملها الانسان انه کان ظلومًا جهولًا یعنے اس امانت کو جو ربوبیت کا کامل اتباع ہے۔ جسکو فقط عبودیت کا ملہ اُٹھا سکتی ہے۔ انسان نے اٹھا لیا

کیونکہ وہ ظلوم اور جہول تھا۔ یعنے خداتعالے کے لئے اپنے نفس پر سختی کر سکتا تھا۔ اور غیراللہ سے اس قدر دور ہو سکتا تھا کہ اس کی صورت علمی سے بھی اسکا ذہن خالی ہو جاتا تھا۔ واضح ہو کہ ہم سخت غلطی کریں گے اگر اس جگہ ظلوم کے لفظ سے کافر اور سرکش اور مشرک اور عدل کو چھوڑنے والا مراد لیں گے۔ کیونکہ یہ ظلوم جہول کا لفظ اس جگہ اللہ جل شانہٗ نے انسان کے لئے مقام مدح میں استعمال کیا ہے۔ نہ مقام ذم میں۔ اور اگر نعوذ باللہ یہ مقام ذم میں ہو تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ سب سے بدتر انسان ہی تھا جس نے خداتعالیٰ کی پاک امانت کو اپنے سر پر اٹھا لیا۔ اور اس کے حکم کو مان لیا۔ بلکہ نعوذ باللہ یوں کہنا پڑے گا کہ سب سے زیادہ ظالم اور جاہل انبیاء اور رسول تھے جنہوں نے سب سے پہلے اس امانت کو اٹھا لیا حالانکہ اللہ جل شانہٗ آپ فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو احسن تقویم میں پیدا کیا ہے پھر وہ سب سے بدتر کیوں ہوا۔ اور انبیاء کو سید المعادلین قرار دیا ہے۔ پھر وہ ظلوم و جہول دوسرے معنوں کی رو سے کیونکر کہلا دیں۔ ماسوا اس کے ایسا خیال کرنے میں خداتعالے پر بھی اعتراض لازم آتا ہے کہ اس کی امانت جو وہ دینی چاہتا تھا وہ کوئی خیر اور صلاحیت اور برکت کی چیز نہیں تھی۔ بلکہ شر اور فساد کی چیز تھی۔ کہ شریر اور ظالم نے اسکو قبول کیا۔ اور نیکوں نے اس کو قبول نہ کیا مگر کیا خداتعالے کی نسبت یہ بدظنی کرنا جائز ہے کہ جو چیز اس کے چشمہ سے نکلے اور جس کا نام وہ اپنی امانت رکھے جو پھر اسی کی طرف رد ہونے کے لائق ہے۔ وہ درحقیقت نعوذ باللہ خراب اور پلید چیز ہو۔ جس کو بجز ایسے ظلوم کے جو درحقیقت سرکش اور نافرمان

اور نعمت عدل سے بکلی بے نصیب ہے۔ کوئی دوسرا قبول نہ کر سکے۔ افسوس کہ ایسے مکروہ خیالوں والے کچھ بھی خدا تعالیٰ کی عظمت نگہ میں نہیں رکھتے۔ وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ امانت اگر سراسر خیر ہے تو پھر اس کا قبول کر لینا ظلم میں کیوں داخل ہے۔ اور اگر امانت خود شر اور فساد کی چیز ہے۔ تو پھر وہ خدا تعالیٰ کی طرف کیوں منسوب کی جاتی ہے۔ کیا خدا تعالیٰ نعوذ باللہ فساد کا مبدا ہے۔ اور کیا جو چیز اس کے پاک چشمہ سے نکلتی ہے۔ اس کا نام فساد اور شر رکھنا چاہیئے؟ ظلمت ظلمت کی طرف جاتی ہے اور نور نور کی طرف سو امانت نور تھی اور انسان ظلوم جہول بھی ان معنوں کر کے جو ہم بیان کر چکے ہیں ایک نور ہے۔ اس لئے نور نے نور کو قبول کر لیا۔ وہ اعلیٰ درجہ کا نور جو انسان کو دیا گیا یعنی انسان کامل کو وہ ملائک میں نہیں تھا۔ نجوم میں نہیں تھا۔ قمر میں نہیں تھا۔ آفتاب میں بھی نہیں تھا۔ وہ زمین کے سمندروں اور دریاؤں میں بھی نہیں تھا۔ وہ لعل اور یاقوت اور زمرد اور الماس اور موتی میں بھی نہیں تھا۔ غرض وہ کسی چیز ارضی و سماوی میں نہیں تھا صرف انسان میں تھا۔ یعنی انسان کامل میں جس کا اتم اور اکمل اور اعلیٰ اور ارفع فرد ہمارے سید و مولیٰ سید الانبیاء سید الاحیاء محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ سو وہ نور اس انسان کو دیا گیا۔ اور حسب مراتب اس کے تمام ہم رنگوں کو بھی یعنی ان لوگوں کو بھی جو کسی قدر وہی رنگ رکھتے ہیں۔ اور امانت سے مراد انسان کامل کے وہ تمام قویٰ اور عقل اور علم اور دل اور جان اور حواس اور خوف اور محبت اور عزت اور وجاہت اور جمیع نعماء روحانی و جسمانی ہیں جو خدا تعالیٰ انسان کامل کو عطا کرتا ہے۔ اور پھر انسان کامل برطبق آیت

ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا" اس ساری امانت کو جناب الٰہی کو واپس دے دیتا ہے۔ یعنی اس میں فانی ہو کر اس کے راہ میں وقف کر دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم مضمون حقیقت اسلام میں بیان کر چکے ہیں۔ اور یہ شان اعلیٰ اور اکمل اور اتم طور پر ہمارے سید ہمارے مولیٰ ہمارے ہادی نبی اُمّی صادق مصدوق محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں پائی جاتی تھی جیسا کہ خود خدا تعالیٰ قرآن کریم میں ہمیں فرماتا ہے؛

"قل ان صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین لا شریک له وبذالک امرت وانا اول المسلمین وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفرلکم ذنوبکم واللہ غفور رحیم فقل اسلمت وجھی للہ۔ وامرت ان اسلم لرب العالمین" یعنی ان کو کہہ دے کہ میری نماز اور میری پرستش میں جدوجہد اور میری قربانیاں اور میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا سب خدا کیلئے اور اس کی راہ میں ہے۔ وہی خدا جو تمام عالموں کا رب ہے جس کا کوئی شریک نہیں۔ اور مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے۔ اور میں اوّل المسلمین ہوں۔ یعنی دنیا کی ابتدا سے اس کے اخیر تک میرے جیسا اور کوئی کامل انسان نہیں۔ جو ایسا اعلیٰ درجہ کا فنافی اللہ ہو۔ جو خدا تعالیٰ کی ساری امانتیں اس کو واپس دینے والا ہو۔ اس آیت میں اُن نادان موحدوں کا رد ہے۔ جو یہ اعتقاد رکھتے ہیں جو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرے انبیاء پر فضیلت کلی ثابت نہیں اور ضعیف حدیثوں کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات سے منع

فرمایا ہے کہ مجھ کو یونس بن متیٰؑ سے بھی زیادہ فضیلت دی جائے۔ یہ نادان نہیں سمجھتے کہ اگر وہ حدیث صحیح بھی ہو تب بھی وہ بطور انکسار اور تذلل ہے۔ جو ہمیشہ ہمارے سید صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت تھی۔ ہر ایک موقعہ اور محل ہوتا ہے۔ اگر کوئی صالح اپنے خط میں احقر عباد اللہ لکھے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ شخص درحقیقت تمام دنیا یہاں تک کہ بت پرستوں اور تمام فاسقوں سے بدتر ہے۔ اور خود اقرار کرتا ہے۔ کہ وہ احقر عباد اللہ ہے۔ کس قدر نادانی اور شرارت نفس ہے۔

غور سے دیکھنا چاہیئے کہ جس حالت میں اللہ جل شانہٗ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام اوّل المسلمین رکھتا ہے۔ اور تمام مطیعوں اور فرمانبرداروں کا سردار ٹھہراتا ہے۔ اور سب سے پہلی امانت کو واپس دینے والا آنحضرت صلعم کو قرار دیتا ہے۔ تو پھر کیا بعد اس کے کسی قرآن کریم کے ماننے والے کو گنجائش ہے کہ آنحضرت صلعم کی شانِ اعلیٰ میں کسی طرح کا جرح کر سکے۔ خدا تعالیٰ نے آیت موصوفہ بالا میں اسلام کے لئے کئی مراتب رکھ کر سب مدارج سے اعلیٰ درجہ وہی ٹھہرایا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فطرت کو عنایت فرمایا۔ سبحان اللہ ما اعظم شانک یا رسول اللہ ۔

موسیٰ و عیسیٰ ہمہ خیل تو اند
جملہ دریں راہ طفیلِ تو اند

پھر بقیہ ترجمہ یہ ہے کہ اللہ جل شانہٗ اپنے رسول کو فرماتا ہے کہ ان کو کہہ دے کہ میری راہ جو ہے وہی راہ سیدھی ہے۔ سو تم اسی کی پیروی کرو اور راہوں پر مت چلو کہ وہ تمہیں خدا تعالیٰ سے دور ڈال

دیں گی۔ ان کو کہہ دے کہ اگر تم خدا تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو آؤ میرے پیچھے پیچھے چلنا اختیار کرو یعنے میرے طریق پر جو اسلام کی اعلیٰ حقیقت ہے قدم مارو تب خدا تعالیٰ تم سے بھی پیار کرے گا۔ اور تمہارے گناہ بخش دے گا ان کو کہہ دے کہ میری راہ یہ ہے۔ کہ مجھے حکم ہوا ہے کہ اپنا تمام وجود خدا تعالیٰ کو سونپ دوں اور اپنے تئیں رب العالمین کے لئے خالص کر لوں یعنے اس میں فنا ہو کر جیسا کہ وہ رب العالمین ہے۔ میں خادم العالمین بنوں اور ہمہ تن اُسی کا اور اُسی کی راہ کا ہو جاؤں۔ سو میں نے اپنا تمام وجود اور جو کچھ میرا تھا خدا تعالیٰ کا کر دیا ہے۔ اب کچھ بھی میرا نہیں۔ جو کچھ میرا ہے۔ وہ سب اُس کا ہے۔

اور یہ وسوسہ کہ ایسے معنے آیت ظلوم و جہول کے کس نے متقدمین سے کئے ہیں اور کون اہل زبان میں سے ظلم کے ایسے معنے بھی کرتا ہے۔ اس وہم کا جواب یہ ہے کہ ہمیں بعد کلام اللہ کے کسی اور سند کی ضرورت نہیں۔ کلام الٰہی کے بعض مقامات بعض کی شرح ہیں۔ پس جس حالت میں خدا تعالیٰ نے بعض متقیوں کا نام بھی ظالم رکھا ہے۔ اور مراتب ثلاثہ تقویٰ میں سے پہلا مرتبہ تقویٰ کا ظلم کو ہی ٹھہرایا ہے۔ تو اس سے ہم نے قطعی اور یقینی طور پر سمجھ لیا کہ اس ظلم کے لفظ سے وہ ظلم مراد نہیں ہے جو تقویٰ سے دور اور کفار اور مشرکین اور نافرمانوں کا شعار ہے۔ بلکہ وہ ظلم مراد ہے۔ جو سالک کی ابتدائی حالت میں متقیوں کے لئے شرط حتم ہے۔ یعنی جذبات نفسانی پر حملہ کرنا اور بشریت کی ظلمت کو اپنے نفس سے کم کرنے کے لئے کوشش کرنا جیسا کہ اس دوسری آیت میں بھی کم کرنے کے ہی معنے ہیں۔ اور وہ یہ ہے:

ولم تظلم منہ شیئاً۔ ای ولم تنقص ۔ دیکھو قاموس اور صحاح اور صراح جو ظلم کے معنے کم کرنے کے بھی لکھے ہیں۔ اور اس آیت کے یہی معنے کئے ہیں۔ یعنے ولم تنقص۔"

ماسوا اس کے اس معنے کے کرنے میں یہ عاجز متفرد نہیں۔ بڑے بڑے محقق اور فضلاء نے جو اہلِ زبان تھے یہی معنے کئے ہیں۔ چنانچہ منجملہ ان کے صاحب فتوحات مکیہ ہیں۔ جو اہلِ زبان بھی ہیں۔ وہ اپنی ایک تفسیر میں جو مصر کے چھاپہ میں چھپ کر شائع ہوئی ہے۔ یہی معنے کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے زیرِ تفسیر آیت "حملها الانسان انه کان ظلوماً جهولاً" یہی معنے لکھے ہیں کہ یہ ظلوم و جہول مقامِ مدح میں ہے۔ اور اس سے مطلب یہی ہے کہ انسان مومن احکام الٰہی کے بجا آوری میں اپنے نفس پر اس طور سے ظلم کرتا ہے جو نفس کے جذبات اور خواہشوں کا مخالف ہو جاتا ہے اور اس سے اس کے جوشوں کو گھٹاتا ہے اور کم کرتا ہے۔ اور صاحب تفسیر حسینی خواجہ محمد پارسا کی تفسیر سے نقل کرتے ہیں۔ کہ آیت کے یہ معنی ہیں کہ انسان نے اس امانت کو اس لئے اٹھا لیا کہ وہ ظلوم تھا۔ یعنے اس بات پر قادر تھا کہ اپنے نفس اور اس کی خواہشوں سے باہر جائے۔ یعنے جذبات نفسانی کو کم بلکہ معدوم کردیوے اور ہویت مطلقہ میں گم ہوجائے۔ اور انسان جہول تھا۔ اس لئے کہ اس میں یہ قوت ہے کہ غیر حق سے بکلی غافل اور نادان ہوجائے۔ اور بقول؛ لاالٰہ الا اللّٰہ نفی ماسوائے کی کردیوے۔ اور ابن جریر بھی جو رئیس المفسرین ہے۔ اس آیت کی شرح میں لکھتا ہے۔ کہ ظلوم اور جہول کا لفظ محل مدح میں ہے

نہ ذم ہیں غرض اکابر اور محققین جن کی آنکھوں کو خدا تعالےٰ نے نورِ معرفت سے منور
کیا تھا وہ اکثر اسی طرف گئے ہیں کہ اس آیت کی بجز اس کے اور کوئی معنے نہیں ہو سکتے
کہ انسان نے خدا تعالےٰ کی امانت کو اٹھا کر ظلوم اور جہول کا خطاب مدح کے طور پر
حاصل کیا نہ ذم کے طور پر۔ چنانچہ ابن کثیر نے بھی بعض روایات اسی کی تائید میں
لکھی ہیں۔ اور اگر ہم اس تمام آیت پر کہ انا عرضنا الامانۃ علی السمٰوٰت
والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان
انہ کان ظلوما جھولا ۔" ایک نظر غور کی کریں تو یقینی طور پر معلوم ہوگا کہ
وہ امانت جو فرشتوں اور زمین اور پہاڑوں اور تمام کائنات پر عرض کی گئی تھی اور
انہوں نے اٹھانے سے انکار کیا تھا وہ جس وقت انسان پر عرض کی گئی تھی۔
تو بلا شبہ سب سے اول انبیاء اور رسولوں کی روحوں پر عرض کی گئی ہوگی کیونکہ
وہ انسانوں کے سردار اور انسانیت کے حقیقی مفہوم کے اول المستحقین ہیں
پس اگر ظلوم اور جہول کے معنے یہی مراد لئے جائیں جو کافر اور مشرک اور
پکے نافرمان کو کہتے ہیں۔ تو پھر نعوذ باللہ سب سے پہلے انبیاء کی نسبت
اس نام کا اطلاق ہوگا۔ لہٰذا یہ بات نہایت روشن اور بدیہی ہے کہ ظلوم
اور جہول کا لفظ اس جگہ محل مدح میں ہے اور ظاہر ہے کہ خدا تعالےٰ کے
حکم کا مان لینا اور اُس سے منہ پھیرنا موجب معصیت نہیں ہو سکتا
بلکہ عین سعادت ہے تو پھر ظلوم اور جہول کے حقیقی معنی جو اِبا اور سرکشی
کو مستلزم ہیں۔ کیونکر اس مقام کے مناسب حال ہو سکتے ہیں۔ جو شخص
قرآنِ کریم کی اسالیب کلام کو بخوبی جانتا ہے اُس پر یہ پوشیدہ نہیں کہ

بعض اوقات وہ کریم ورحیم جل شانہٗ اپنے خواص عباد کے لئے ایسا لفظ استعمال کر دیتا ہے کہ بظاہر بدنما ہوتا ہے۔ مگر معناً نہایت محمود اور تعریف کا کلمہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ اللہ جل شانہٗ نے اپنے نبی کریم کے حق میں فرمایا ووجدك ضالاً فھدیٰ اب ظاہر ہے کہ ضال کے معنے مشہور اور متعارف جو اہل لغت کے منہ پر چڑھے ہوئے ہیں گمراہ کے ہیں جس کے اعتبار سے آیت کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ خدا تعالےٰ نے (اے رسول اللہ) تجھ کو گمراہ پایا اور ہدایت دی۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کبھی گمراہ نہیں ہوئے۔ اور جو شخص مسلمان ہو کر یہ اعتقاد رکھے کہ کبھی آنحضرت صلعم نے اپنی عمر میں ضلالت کا عمل کیا تھا تو وہ کافر بے دین اور حدِ شرعی کے لائق ہے۔ بلکہ آیت کے اس جگہ وہ معنی لینے چاہئیں جو آیت کے سیاق اور سباق سے ملتے ہیں اور وہ یہ ہے۔ کہ اللہ جل شانہٗ نے پہلے آنحضرت صلعم کی نسبت فرمایا۔ الم یجدك یتیماً فاویٰ و وجدك ضالاً فھدیٰ و وجدك عائلاً فاغنیٰ ۔ یعنی خدا تعالیٰ نے تجھے یتیم اور بیکس پایا اور اپنے پاس جگہ دی اور تجھ کو ضال (یعنی عاشق وجہ اللہ) پایا پس اپنی طرف کھینچ لایا۔ اور تجھے درویش پایا پس غنی کر دیا۔ ان معنوں کی صحت پر یہ ذیل کی آیتیں قرینہ ہیں جو ان کے بعد آتی ہیں۔ یعنی یہ کہ فاما الیتیم فلا تقھر واما السائل فلا تنھر واما بنعمۃ ربك فحدث کیونکہ یہ تمام آیتیں لف نشر مرتب کے طور پر ہیں۔ اور پہلی آیتوں میں جو مدعا مخفی ہے۔ دوسری آیتیں اس کی تفصیل اور تصریح کرتی ہیں۔ مثلاً پہلے فرمایا: الم یجدك یتیماً فاوی اس کے مقابل پر یہ فرمایا: فاما الیتیم فلا تقھر یعنے یاد کر کہ تو بھی یتیم تھا

اور ہم نے تجھ کو پناہ دی۔ ایسا ہی تو بھی یتیموں کو پناہ دے۔ پھر بعد اس آئت کے فرمایا: ووجدك ضالاً فهدى۔ اس کے مقابل پر یہ فرمایا: واما السائل فلا تنهر یعنے یاد کر کہ تو بھی ہمارے وصال اور جمال کا سائل اور ہمارے حقائق اور معارف کا طالب تھا سو جیسا کہ ہم نے باپ کی جگہ ہو کر تیری جسمانی پرورش کی اور ایسا ہی ہم نے استاد کی جگہ ہو کر تمام دروازے علوم کے تجھ پر کھول دیئے۔ اور اپنے لقا کا شربت سب سے زیادہ عطا فرمایا اور جو تو نے مانگا سب ہم نے تجھ کو دیا۔ سو تو بھی مانگنے والوں کو رد مت کر اور ان کو مت جھڑک۔ اور یاد کر کہ تو عائل تھا اور تیری معیشت کے ظاہری اسباب بکلی منقطع تھے۔ سو خدا خود تیرا متولی ہوا۔ اور غیروں کی طرف حاجت پہنچانے سے تجھے غنی کر دیا نہ تو والد کا محتاج ہوا نہ والدہ کا نہ استاد کا اور نہ کسی غیر کی طرف حاجت لے جانے کا بلکہ یہ سارے کام تیرے خدا تعالےٰ نے آپ ہی کر دیئے۔ اور پیدا ہوتے ہی اس نے تجھ کو آپ سنبھال لیا۔ سو اس کا شکر بجا لا اور حاجت مندوں سے تو بھی ایسا ہی معاملہ کر۔ اب ان تمام آیات کا مقابلہ کر کے صاف طور پر کھلتا ہے۔ کہ اس جگہ ضال کے معنی گمراہ نہیں ہے۔ بلکہ انتہائے درجہ کے تعشق کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ حضرت یعقوب کی نسبت اسی کے مناسب یہ آیت ہے۔ انك لفى ضلالك القديم سو یہ دونوں لفظ ظلم اور ضلالت اگرچہ ان معنوں پر بھی آتے ہیں کہ کوئی شخص جادۂ اعتدال اور انصاف کو چھوڑ کر اپنے شہوات غضبیہ یا بہیمیہ کا تابع ہو جاوے۔ لیکن قرآن کریم میں عشاق کے حق میں بھی آئے ہیں۔ جو خدا تعالیٰ کے راہ میں عشق کی مستی میں اپنے نفس اور اس کے جذبات کو پیروں کے نیچے

کھل دیتے ہیں۔ اسی کے مطابق حافظ شیرازی کا یہ شعر ہے۔ ؎

آسمان بارِ امانت نتوانست کشید

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

اس دیوانگی سے حافظ صاحب حالت تعشق اور شدت حرص اطاعت مراد لیتے ہیں۔ غرض ان آیتوں کی حقیقت واقعی یہی ہے۔ جو خدا تعالےٰ نے میرے پر کھولی اور میں ہرگز ایسے معنی نہیں کروں گا۔ جس سے ایک طرف تو یہ لازم آوے کہ خدا تعالےٰ کی طرف سے یہ پاک امانت نہیں تھی۔ بلکہ کوئی فساد کی بات تھی۔ جو ایک مفسد ظالم نے قبول کر لی اور نیکوں نے اس کو قبول نہ کیا اور دوسری طرف تمام مقدس رسولوں اور نبیوں کو جو اول درجہ پر امانت کے حامل ہیں ظالم ٹھہرایا جاوے۔

اور میں بیان کر چکا ہوں کہ دراصل امانت اور اسلام کی حقیقت ایک ہی ہے اور امانت اور اسلام دراصل محمود چیز ہے۔ جس کے یہ معنی ہیں کہ خدا تعالےٰ کا دیا ہوا اسی کو واپس دیا جاوے جیسے امانت واپس دی جاتی ہے۔ پس جس نے ایک محمود اور پسندیدہ چیز کو قبول کر لیا اور خدا تعالےٰ کے حکم سے مُنہ نہ پھیرا اور اس کی مرضی کو اپنی مرضی پر مقدم رکھا وہ لائق مذمت کیوں ٹھہرے اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ اس آیت کے آگے خدا تعالیٰ فرماتا ہے: لیعذّب اللہ المنافقین والمنافقات والمشرکین والمشرکات ویتوب اللہ علی المؤمنین والمؤمنات وکان اللہ غفوراً رحیماً۔" یعنے انسان نے جو امانت اللہ کو قبول کر لیا تو اس سے یہ لازم آیا جو منافقین اور منافقات اور مشرکین اور مشرکات جنہوں نے

صرف زبان سے قبول کیا اور عملاً اس کے پابند نہیں ہوئے وہ معذّب ہوں اور مومنین اور مومنات جنہوں نے امانت کو قبول کر کے عملاً پابندی بھی اختیار کی وہ مورد رحمت الہٰی ہوں۔ یہ آیت بھی صاف اور صریح طور پر بول رہی ہے کہ آیت موصوفہ میں ظلوم وجہول سے مراد مومن ہیں۔ جن کی طبیعتوں اور استعدادوں نے امانت کو قبول کر لیا۔ اور پھر اس پر کاربند ہو گئے۔ کیونکہ صاف ظاہر ہے۔ کہ مشرکوں اور منافقوں نے کامل طور پر قبول نہیں کیا اور حملھا الانسان میں جو انسان کے لفظ پر الف لام ہے وہ بھی درحقیقت تخصیص کے لئے ہے۔ جس سے خداتعالےٰ کا یہ منشا ثابت ہوتا ہے۔ کہ تمام انسانوں نے اس امانت کو کامل طور پر قبول نہیں کیا۔ صرف مومنوں نے قبول کیا ہے۔ اور منافقوں اور مشرکوں کی فطرتوں میں گو ایک ذرہ استعداد کا موجود تھا مگر بوجہ نقصان استعداد وہ کامل طور پر اس پیارے لفظ ظلوم اور جہول سے حصّہ نہ لے سکے۔ اور جن کو بڑی قوت ملی تھی وہ کامل طور پر اس نعمت کو لے گئے۔ انہوں نے اس امانت کے قبول کرنے کا صرف اپنی زبان سے اقرار نہیں کیا۔ بلکہ اپنے اعمال اور افعال میں ثابت کر کے دکھلا دیا۔ اور جو امانت لی تھی کمال دیانت کے ساتھ اس کو واپس دے دیا۔

بالآخر یہ بھی واضح ہے کہ جہول کا لفظ بھی ظلوم کے لفظ کی طرح ان معنوں میں استعمال کیا گیا ہے۔ جو اتقا اور استغفار کے مناسب حال ہیں کیونکہ اگر جاہلیت کا حقیقی مفہوم مراد ہو جو علوم اور عقاید صحیحہ سے بیخبری اور ناراست اور بیہودہ باتوں میں مبتلا ہونا ہے۔ تو یہ تو صریح متقیوں کی صفت کے برخلاف ہے۔ کیونکہ

حقیقی تقوےٰ کے ساتھ جاہلیت جمع نہیں ہو سکتی۔ حقیقی تقوےٰ اپنے ساتھ ایک نور رکھتی ہے۔ جیسا کہ اللہ جل شانہ فرماتا ہے: یا ایھا الذین آمنوا ان تتقوا اللہ یجعل لکم فرقانا و یجعل لکم نورا تمشون بہ۔ یعنے اے ایمان لانے والو اگر تم متقی ہونے پر ثابت قدم رہو اور اللہ تعالےٰ کے لئے اتقا کی صفت میں قیام اور استحکام اختیار کرو تو خدا تعالےٰ تم میں اور تمہارے غیروں میں فرق رکھ دے گا۔ وہ فرق یہ ہے کہ تم کو ایک نور دیا جائے گا۔ جس نور کے ساتھ تم اپنی تمام راہوں میں چلو گے۔ یعنے وہ نور تمہارے تمام افعال اور اقوال اور قویٰ اور حواس میں آجائے گا۔ تمہاری عقل میں بھی نور ہوگا اور تمہاری ایک اٹکل کی بات میں بھی نور ہوگا۔ اور تمہاری آنکھوں میں بھی نور ہوگا۔ اور تمہارے کانوں اور تمہاری زبانوں اور تمہارے بیانوں اور تمہاری ہر ایک حرکت اور سکون میں نور ہوگا۔ اور جن راہوں میں تم چلو گے وہ راہیں نورانی ہو جائیں گی۔ غرض جتنی تمہاری راہیں ہیں وہ سب نور سے بھر جائیں گی۔ اور تم سراپا نور ہی میں چلو گے۔

اب اس آیت سے صاف طور پر ثابت ہوتا ہے۔ کہ تقوےٰ سے جاہلیت ہرگز جمع نہیں ہو سکتی۔ ہاں فہم اور ادراک حسب مراتب تقوےٰ کم و بیش ہو سکتا ہے۔ اسی مقام سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ بڑی اور اعلےٰ درجہ کی کرامت جو اولیاء اللہ کو دیجاتی ہے۔ جن کو تقوےٰ میں کمال ہوتا ہے۔ وہ یہی دیجاتی ہے۔ کہ ان کے تمام حواس اور عقل اور فہم اور قیاس میں نور رکھا جاتا ہے۔ اور ان کی قوت کشفی نور کے پانیوں سے ایسی صفائی حاصل کر لیتی ہے۔ کہ جو دوسروں کو نصیب نہیں ہوتی۔ ان کے حواس نہایت باریک بین ہو جاتے ہیں۔ اور معارف اور حقائق کے پاک

چشمے ان پر کھولے جاتے ہیں۔ اور فیض ساتع ربانی ان کی رگ و ریشہ میں خون کی طرح جاری ہو جاتا ہے۔

لمّۃ الملک ولمّۃ ابلیس کی حقیقت

اور اس پر اعتراضات کے جوابات

اور اگر یہ سوال ہو کہ قرآن کریم میں اس بات کی کہاں تشریح یا اشارہ ہے کہ رُوح القدس مقربوں میں ہمیشہ رہتا ہے۔ اور ان سے جدا نہیں ہوتا۔ تو اس کا یہ جواب ہے کہ سارا قرآن کریم ان تصریحات اور اشارات سے بھرا پڑا ہے۔ بلکہ وہ ہر ایک مومن کو روح القدس ملنے کا وعدہ دیتا ہے۔ چنانچہ منجملہ ان آیات کے جو اس بارہ میں کھلے کھلے بیان سے ناطق ہیں۔ سورۃ الطارق کی پہلی دو آیتیں ہیں اور وہ یہ ہیں:-

والسمآءِ والطارق وما ادرٰیک ما الطارق النجم الثاقب
ان کل نفسٍ لما علیها حافظ۔

ان آیات کا ترجمہ یہ ہے کہ قسم ہے آسمان کی اور اس کی جو رات کو آنے والا ہے۔ اور تجھے کیا خبر ہے کہ رات کو آنے والی کیا چیز ہے۔ وہ ایک چمکتا ہوا ستارہ ہے۔ اور قسم اس بات کے لئے ہے کہ ایک بھی ایسا جی نہیں کہ جو اس پر نگہبان نہ ہو۔ یعنے ہر ایک نفس پر نفوس فلکیات میں سے ایک فرشتہ

موکل ہے جو اس کی نگہبانی کرتا ہے۔ اور ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔
خدا تعالےٰ نے جو اس آیت کو کلی طور پر یعنی کُل کے لفظ سے مقید کر کے بیان
فرمایا ہے اس سے یہ بات بخوبی ثابت ہو گئی۔ کہ ہر یک چیز جس پر نفس کا نام
اطلاق پا سکتا ہے۔ اُس کی فرشتے حفاظت کرتے ہیں۔ پس بموجب اس آیت کے
نفوس کواکب کی نسبت بھی یہ عقیدہ رکھنا پڑا کہ کل ستارے کیا سورج کیا چاند
کیا زحل کیا مشتری ملائک کی زیر حفاظت ہیں یعنے ہر یک کے لئے سورج
اور چاند وغیرہ میں سے ایک ایک فرشتہ مقرر ہے۔ جو اس کی حفاظت کرتا ہے
اور اس کے کاموں کو احسن طور پر چلاتا ہے۔

اس جگہ کئی اعتراض پیدا ہوتے ہیں۔ جن کا دفعہ کرنا ہمارے ذمہ ہے
از انجملہ ایک یہ کہ جس حالت میں روح القدس صرف ان مقربوں کو ملتا
ہے۔ کہ جو بقا اور لقا کے مرتبہ تک پہنچتے ہیں۔ تو پھر ہر ایک کا نگہبان کیونکر
ہو سکتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ روح القدس کا کامل طور پر نزول مقربوں پر
ہی ہوتا ہے۔ مگر اس کی فی الجملہ تائید حسب مراتب محبت و اخلاص دوسروں کو بھی
ہوتی ہے۔ ہماری تقریر مندرجہ بالا کا صرف یہ مطلب ہے۔ کہ روح القدس کی اعلیٰ
تجلی کی کیفیت یہ ہے کہ جب بقا اور لقا کے مرتبہ پر محبت الٰہی انسان کی محبت پر
نازل ہوتی ہے۔ تو یہ اعلےٰ تجلی روح القدس کی اُن دونوں محبتوں کے ملنے سے پیدا ہوتی
ہے۔ جس کے مقابل پر دوسری تجلیات کالعدم ہیں۔ مگر یہ تو نہیں کہ دوسری تجلیات
کا وجود ہی نہیں۔ خدا تعالےٰ ایک ذرہ محبت خالصہ کو بھی ضائع نہیں کرتا۔ انسان
کی محبت پر اس کی محبت نازل ہوتی ہے۔ اور اُسی مقدار پر روح القدس کی چمک

پیدا ہوتی ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا ایک بندھا ہوا قانون ہے کہ ہر ایک محبت کے اندازہ پر الہٰی محبت نزول کرتی رہتی ہے۔ اور جب انسانی محبت کا ایک دریا بہ نکلتا ہے تو اس طرف سے بھی ایک دریا نازل ہوتا ہے۔ اور جب وہ دونوں دریا ملتے ہیں تو ایک عظیم الشان نور ان میں سے پیدا ہوتا ہے جو ہماری اصطلاح میں روح القدس سے موسوم ہے۔ لیکن جیسے تم دیکھتے ہو کہ اگر بیس سیر پانی میں ایک ماشہ مصری ڈال دی جائے تو کچھ بھی مصری کا ذائقہ معلوم نہیں ہوگا۔ اور پانی پھیکے کا پھیکا ہی ہوگا۔ مگر یہ نہیں کہہ سکتے کہ مصری اس میں نہیں ڈالی گئی۔ اور نہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ پانی میٹھا ہے۔

یہی حال اُس روح القدس کا ہے جو ناقص طور پر ناقص لوگوں پر اترتا ہے اُس کے اُترنے میں تو شک نہیں ہو سکتا کیونکہ ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی کو بھی نیکی کا خیال روح القدس سے پیدا ہوتا ہے۔ کبھی فاسق اور فاجر اور بدکار بھی سچی خواب دیکھ لیتا ہے۔ اور یہ سب روح القدس کا اثر ہوتا ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم اور احادیث صحیحہ نبویہ سے ثابت ہے مگر وہ تعلق عظیم جو مقدسوں اور مقربوں کے ساتھ ہے۔ اس کے مقابل پر یہ کچھ چیز نہیں گویا کالعدم ہے۔

ازانجملہ ایک یہ سوال ہے۔ کہ جس حالت میں روح القدس انسان کو بدیوں سے روکنے کے لئے مقرر ہے تو پھر اُس سے گناہ کیوں سرزد ہوتا ہے۔ اور انسان کفر اور فسق اور فجور میں کیوں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ جواب ہے کہ خدا تعالیٰ نے انسان کے لئے ابتلا کے طور پر دو روحانی داعی مقرر کر رکھی ہیں۔ ایک داعی خیر جس کا نام روح القدس ہے اور ایک داعی شر جس کا نام

ابلیس اور شیطان ہے۔ یہ دونوں داعی صرف خیر یا شر کی طرف بلاتے رہتے ہیں مگر کسی بات پر جبر نہیں کرتے۔ جیسا کہ اس آیت کریمہ میں اسی امر کی طرف اشارہ ہے: فالھمھا فجورھا وتقوٰھا۔ یعنی خدا بدی کا بھی الہام کرتا ہے اور نیکی کا بھی۔ بدی کے الہام کا ذریعہ شیطان ہے جو شرارتوں کے خیالات دلوں میں ڈالتا ہے۔ اور نیکی کے الہام کا ذریعہ روح القدس ہے جو پاک خیالات دل میں ڈالتا ہے۔ اور چونکہ خداتعالیٰ علت العلل ہے اس لئے یہ دونوں الہام خداتعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کر لئے۔ کیونکہ اسی کی طرف سے یہ سارا انتظام ہے۔ ورنہ شیطان کیا حقیقت رکھتا ہے۔ جو کسی کے دل میں وسوسہ ڈالے اور روح القدس کیا چیز جو کسی کو تقوٰے کی راہوں کی ہدایت کرے ہمارے مخالف آریہ اور برہمو اور عیسائی اپنی کوتاہ بینی کی وجہ سے قرآن کریم کی تعلیم پر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ اس تعلیم کی رو سے ثابت ہوتا ہے کہ خداتعالیٰ نے دانستہ انسان کے پیچھے شیطان کو لگا رکھا ہے۔ گویا اس کو آپ ہی خلق اللہ کا گمراہ کرنا منظور ہے۔ مگر یہ ہمارے شتاب باز مخالفوں کی غلطی ہے۔ ان کو معلوم کرنا چاہیئے کہ قرآن کریم کی یہ تعلیم نہیں ہے۔ کہ شیطان گمراہ کرنے کے لئے جبر کر سکتا ہے۔ اور نہ یہ تعلیم ہے کہ صرف بدی کی طرف بلانے کے لئے شیطان کو مقرر کر رکھا ہے۔ بلکہ یہ تعلیم ہے کہ آزمائش اور امتحان کی غرض سے لمہ ملک اور لمہ ابلیس برابر طور پر انسان کو دیئے گئے ہیں۔ یعنی ایک داعی خیر اور ایک داعی شر تا انسان اس ابتلا میں پڑ کر مستحق ثواب یا عتاب کا ٹھہر سکے۔ کیونکہ اگر اس کے لئے ایک ہی طور کے اسباب پیدا کئے جاتے۔ مثلاً اگر اس کے بیرونی

اور اندرونی اسباب جذبات فقط نیکی کی طرف ہی اس کو کھینچتے یا اس کی فطرت ہی ایسی واقعہ ہوتی۔ کہ وہ بجز نیکی کے کاموں کے اور کچھ کر ہی نہ سکتا تو کوئی وجہ نہیں تھی۔ کہ نیک کاموں کے کرنے سے اس کو کوئی مرتبہ قرب کا مل سکے کیونکہ اس کے لئے تو تمام اسباب و جذبات نیک کام کرنے کے ہی موجود ہیں۔ یا یہ کہ بدی کی خواہش تو ابتدا سے ہی اس کی فطرت سے مسلوب ہے۔ تو پھر بدی سے بچنے کا اس کو ثواب کس استحقاق سے ملے مثلاً ایک شخص ابتدا سے ہی نامرد ہے جو عورت کی کچھ خواہش نہیں رکھتا اب اگر وہ ایک مجلس میں یہ بیان کرے کہ میں فلاں وقت جوان عورتوں کے ایک گروہ میں رہا جو خوب صورت بھی تھیں مگر میں ایسا پرہیزگار رہوں کہ میں نے ان کو شہوت کی نظر سے ایک دفعہ بھی نہیں دیکھا اور خدا تعالےٰ سے ڈرتا رہا۔ تو کچھ شک نہیں کہ سب لوگ اس کے اس بیان پر ہنسیں گے۔ اور طنز سے کہیں گے کہ اے نادان کب اور کس وقت تجھ میں یہ قوت موجود تھی۔ تا اس کے روکنے پر تو فخر کر سکتا۔ یا کسی ثواب کی اُمید رکھتا۔

پس جاننا چاہیئے کہ سالک کو اپنی ابتدائی اور درمیانی حالات میں تمام امیدیں ثواب کی مخالفانہ جذبات سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور ان منازل سلوک میں جن امور میں فطرت ہی سالک کی ایسی واقع ہو کہ اس قسم کی بدی وہ کر ہی نہیں سکتا تو اس قسم کے ثواب کا بھی وہ مستحق نہیں ہو سکتا۔ مثلاً ہم بچھو اور سانپ کی طرح اپنے وجود میں ایک ایسی زہر نہیں رکھتے جس کے ذریعہ سے ہم کسی کو اس قسم کی ایذا پہنچا سکیں جو کہ سانپ اور بچھو پہنچاتے ہیں۔ سو ہم اس قسم کی ترک بدی میں عنداللہ کسی ثواب کے مستحق بھی نہیں۔

اب اس تحقیق سے ظاہر ہوا کہ مخالفانہ جذبات جو ان میں پیدا ہو کر انسان کو بدی کی طرف کھینچتے ہیں درحقیقت وہی انسان کے ثواب کا بھی موجب ہیں۔ کیونکہ جب وہ خدا تعالےٰ سے ڈر کر ان مخالفانہ جذبات کو چھوڑ دیتا ہے۔ تو عنداللہ بلاشبہ تعریف کے لائق ٹھہر جاتا ہے۔ اور اپنے رب کو راضی کر لیتا ہے۔

لیکن جو شخص انتہائی مقام کو پہنچ گیا ہے۔ اس میں مخالفانہ جذبات نہیں رہتے گویا اس کا جن مسلمان ہو جاتا ہے۔ مگر ثواب باقی رہ جاتا ہے۔ کیونکہ وہ ابتلا کے منازل کو بڑی مردانگی کے ساتھ طے کر چکا ہے

جیسے ایک صالح آدمی جس نے بڑے بڑے نیک کام اپنی جوانی میں کئے ہیں اپنی پیرانہ سالی میں بھی ان کا ثواب پاتا ہے۔

ازاں جملہ ایک یہ اعتراض ہے کہ خدا تعالےٰ کو فرشتوں سے کام لینے کی کیا حاجت ہے۔ کیا اس کی بادشاہی بھی انسانی سلطنتوں کی طرح عملہ کی محتاج ہے۔ اور اس کو بھی فوجوں کی حاجت تھی۔ جیسی انسان کو حاجت ہے۔ اما الجواب

پس واضح ہو کہ خدا تعالےٰ کو کسی چیز کی حاجت نہیں نہ فرشتوں کی نہ آفتاب کی نہ ماہتاب کی نہ ستاروں کی لیکن اسی طرح اس نے چاہا کہ تا اس کی قدرتیں اسباب کے توسط سے ظاہر ہوں اور تا اس طرز سے انسانوں میں حکمت اور علم پھیلے۔

اگر اسباب کا توسط درمیان نہ ہوتا تو نہ دنیا میں علم ہیئت ہوتا نہ نجوم نہ طبعی نہ طبابت نہ علم نباتات یہ اسباب ہی ہیں جن سے علم پیدا ہوئے۔

تم سوچ کر دیکھو کہ اگر فرشتوں سے خدمت لینے سے کچھ اعتراض ہے تو وہی

اغراض سورج اور چاند اور کواکب اور نباتات اور جمادات اور عناصر سے خدمت لینے میں پیدا ہوتا ہے۔ جو شخص معرفت کا کچھ حصّہ رکھتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہریک ذرہ خدا تعالےٰ کے ارادہ کے موافق کام کر رہا ہے۔ اور ایک قطرہ پانی کا جو ہمارے اندر جاتا ہے۔ وہ بھی بغیر اذن الہٰی کے کوئی تاثیر موافق یا مخالف ہمارے بدن پر ڈال نہیں سکتا۔

پس تمام ذرات اور سیارات وغیرہ درحقیقت ایک قسم کے فرشتے ہیں جو دن رات خدمت میں مشغول ہیں۔ کوئی انسان کے جسم کی خدمت میں مشغول ہے۔ اور کوئی روح کی خدمت میں اور جس حکیم مطلق نے انسان کی جسمانی تربیت کے لئے بہت سے اسباب کا توسط پسند کیا اور اپنی طرف سے بہت سے جسمانی موثرات پیدا کئے تا انسان کے جسم پر انواع اقسام کے طریقوں سے تاثیر ڈالیں۔ اسی وحدہٗ لاشریک نے جس کے کاموں میں وحدت اور تناسب ہے یہ بھی پسند کیا۔ کہ انسان کی روحانی تربیت بھی اسی نظام اور طریق سے ہو کہ جو جسم کی تربیت میں اختیار کیا گیا۔ تا وہ دونوں نظام ظاہری و باطنی اور روحانی اور جسمانی اپنے تناسب اور یکرنگی کی وجہ سے صانع واحد مدبّر بالارادہ پر دلالت کریں۔

پس یہی وجہ ہے۔ کہ انسان کی روحانی تربیت بلکہ جسمانی تربیت کے لئے بھی فرشتے وسائط مقرر کئے گئے مگر یہ تمام وسائط خدا تعالےٰ کے ہاتھ میں مجبور اور ایک کل کی طرح ہیں جسکو اسکا پاک ہاتھ چلا رہا ہے اپنی طرف سے نہ کوئی ارادہ رکھتے ہیں نہ کوئی تصرّف۔ جس طرح ہوا خدا تعالےٰ کے حکم سے ہمارے اندر چلی جاتی ہے۔ اور اُسی کے حکم سے باہر آتی ہے۔ اور اُسی کے حکم سے

تاثیر کرتی ہے ۔ یہی صورت اور تمام یہی حال فرشتوں کا ہے ؛ یفعلون ما یؤمرون - پنڈت دیانند نے جو فرشتوں کے اس نظام پر اعتراض کیا ہے۔ کاش پنڈت صاحب کو خدا تعالےٰ کے نظام جسمانی اور روحانی کا علم ہوتا۔ تا بجائے اعتراض کرنے کے کمالات تعلیم قرآنی کے قائل ہو جاتے کہ کیسی قانونِ قدرت کی صحیح اور سچی تصویر اس میں موجود ہے۔

ازاں جملہ ایک یہ اعتراض ہے کہ قرآن کریم کے بعض اشارات اور ایسا ہی بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ بعض ایام میں جبرائیلؑ کے اترنے میں کسی قدر توقف بھی وقوع میں آتی ہے۔ یعنی آنحضرت صلعم کے ایام بعثت میں یہ بھی اتفاق ہوا ہے۔ کہ بعض اوقات کئی دن تک جبرائیلؑ آنحضرت صلعم پر نازل نہیں ہوا۔ اگر حضرت جبرائیل ہمیشہ اور ہر وقت قرین دائمی آنحضرت صلعم تھے اور روح القدس کا اثر ہمیشہ کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود پر جاری وساری تھا تو پھر توقف نزول کے کیا معنے ہیں ؟ اما الجواب پس واضح ہو کہ ایسا خیال کرنا کہ روح القدس کبھی انبیاء کو خالی چھوڑ کر آسمان پر چڑھ جاتا ہے۔ صرف ایک دھوکہ ہے کہ جو بوجہ غلط فہمی نزول اور صعود کے معنوں کے دلوں میں متمکن ہو گیا ہے۔ پوشیدہ نہ رہے کہ نزول کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں۔ کہ کوئی فرشتہ آسمان سے اپنا مقام اور مقر چھوڑ کر زمین پر نازل ہو جاتا ہے۔ ایسے معنے تو صریح نصوص قرآنیہ اور حدیثیہ کے مخالف ہیں۔ چنانچہ فتح البیان میں ابن جریر سے بروایت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ حدیث مروی ہے : قالت قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما فی السماء موضع قدم الا علیہ ملک ساجد او قائم و ذٰلک قول الملائکۃ وما منا الا لہ

مقام معلوم :- یعنی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ آسمان پر ایک قدم کی بھی ایسی جگہ خالی نہیں جس میں کوئی فرشتہ ساجد یا قائم نہ ہو۔ اور یہی معنے اس آیت کے ہیں۔ کہ ہم میں سے ہر ایک شخص ایک مقام معلوم یعنے ثابت شدہ رکھتا ہے۔ جس سے ایک قدم اُوپر یا نیچے نہیں آسکتا۔ اب دیکھو اس حدیث سے صاف طور پر ثابت ہوگیا کہ فرشتے اپنے مقامات کو نہیں چھوڑتے۔ اور کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوتا کہ ایک قدم کی جگہ بھی آسمان پر خالی نظر آوے مگر افسوس کہ بٹالوی صاحب اور دہلوی شیخ صاحب بھی اب تک اس زمانہ میں کہ علوم حسیہ طبیہ کا فروغ ہے۔ یہی عقیدہ رکھتے ہیں کہ آسمان کا صرف باندازہ ایک قدم خالی رہنا کیا مشکل بات ہے۔ بعض اوقات تو بڑے بڑے فرشتوں کے نزول سے ہزارہا کوس تک آسمان خالی ویران سنسان پڑا رہ جاتا ہے۔ جس میں ایک فرشتہ بھی نہیں ہوتا کیونکہ جب چھ سو موتیوں کے پروں والا فرشتہ جس کا طول مشرق سے مغرب تک ہے۔ یعنی جبرائیل زمین پر اپنا سارا وجود لے کر اتر آیا تو پھر سوچنا چاہیئے کہ ایسے جسیم فرشتہ کے اترنے سے ہزارہا کوس تک آسمان خالی رہ جائے گا۔ یا اس سے کم ہوگا۔ شیخ الکل کہلانا اور احادیث نبویہ کو نہ سمجھنا جائے افسوس اور جائے شرم۔

الغرض جیسا کہ ہم ابھی بیان کر چکے ہیں یہ بات نہایت احتیاط سے اپنے حافظہ میں رکھ لینی چاہیئے کہ مقربوں کا رُوح القدس کی تاثیر سے علیحدہ ہونا ایک دم کے لئے بھی ممکن نہیں۔ کیونکہ ان کی نئی زندگی کی رُوح یہی رُوح القدس ہے۔ پھر وہ اپنی رُوح سے کیونکر علیحدہ ہو سکتے ہیں۔ اور جس علیحدگی کا ذکر احادیث اور

بعض اشارات قرآن کریم میں پایا جاتا ہے۔ اس سے مراد صرف ایک قسم کی تجلی ہے کہ بعض اوقات بوجہ مصالح الٰہی اس قسم کی تجلی میں کچھ دیر ہو گئی ہے اور اصطلاح قرآن کریم میں اکثر نزول سے مراد وہی تجلی ہے۔ ورنہ ذرہ سوچنا چاہیئے کہ جس آفتاب صداقت کے حق میں یہ آیت ہے: ما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ یعنی اس کا کوئی نطق اور کوئی کلمہ اپنے نفس اور ہوا کی طرف سے نہیں وہ تو سراسر وحی ہے جو اس کے دل پر نازل ہو رہی ہے اس کی نسبت کیا ہم خیال کر سکتے ہیں کہ وہ مدتوں نزول وحی سے بکلی خالی ہی رہ جاتا ہے۔ مثلاً یہ جو منقول ہے کہ بعض دفعہ چالیس دن اور بعض دفعہ بیس دن اور بعض دفعہ اس سے زیادہ ساٹھ دن تک بھی وحی نازل نہیں ہوئی۔ اگر اس عدم نزول سے یہ مراد ہے کہ فرشتہ جبرائیل بکلی آنحضرت صلعم کو اس عرصہ تک چھوڑ کر چلا گیا تو یہ سخت اعتراض پیش آئے گا۔ کہ اس مدت تک جس قدر آنحضرت صلعم نے باتیں کیں کیا وہ احادیث نبویہ میں داخل نہیں تھیں اور کیا وحی غیر متلو ان کا نام نہیں تھا۔ اور کیا اس عرصہ میں آنحضرت صلعم کو کوئی خواب بھی نہیں آئی تھی۔ جو بلا شبہ وحی میں داخل ہے۔ اور اگر حضرت بٹالوی صاحب اور میاں نذیر حسین دہلوی سچے ہیں اور یہ بات صحیح ہے کہ ضرور مدتوں جبرائیل آنحضرت صلعم کو چھوڑ کر چلا جاتا تھا اور آنحضرت صلعم بکلی وحی سے خالی رہ جاتے تھے تو بلا شبہ ان دنوں کی احادیث ان دونوں حضرتوں کے نزدیک قابل اعتبار نہیں ہوں گی۔ کیونکہ وحی کی روشنی سے خالی ہیں اور ان کے نزدیک ان دنوں میں خوابوں کا سلسلہ بھی بکلی بند تھا۔ اب منصف و مکیوکہ کیا ان دونوں شیخوں کی بے ادبی آنحضرت صلعم کی نسبت انتہا کو پہنچ گئی یا نہیں۔ وہ آفتاب صداقت جس کا کوئی دل کا خطرہ بھی بغیر وحی کی تحریک کے نہیں اس کے بارے میں ان لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ گویا وہ نعوذ باللہ مدتوں ظلمت میں ہی پڑا رہتا تھا۔ اور اس کے ساتھ کوئی روشنی نہ تھی (کیا کوئی عاشق رسول حضرت نبی کریم صلعم کی شان کے متعلق ایسا غلط عقیدہ رکھ سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ از ناقل)